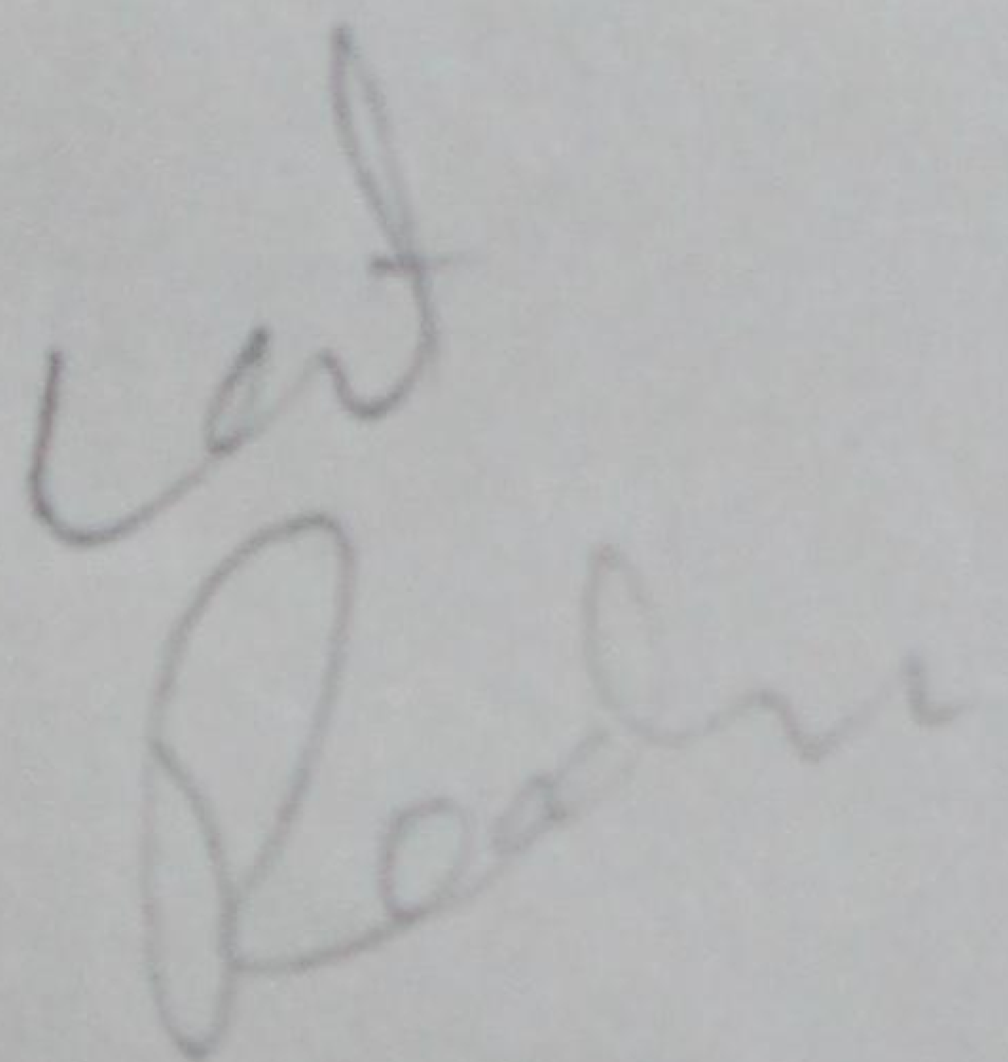


# روشن اندھیرا

شمیم کرہانی

کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

ملنے کا پتہ

کتاب خانہ "دانش محل" امین الدولہ پارک، لکھنؤ

اول نومبر ۱۹۴۶ء



قیمت ایک روپیہ



مرزا محمد جواد، مالک "نظامی پریس" نے
سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے چھپوا کر شائع کیا

محترمی رفیع احمد قدوائیؒ

کے نام

# فہرست

| صفحات | عنوانات | نمبر شمار |
|---|---|---|

# پیش لفظ

(علی جواد زیدی)

۱۰ اگست ۴۲ء کی صبح کو گہرے بادل فضا پر چھائے ہوئے تھے، ہوا میں نرمی اور خنکی تھی گرد و پیش کی ہر چیز رُکی رُکی سی معلوم ہو رہی تھی۔ ہم اور شمیم واقعاتِ حاضرہ پر بڑی گرم جوشی سے بحث کر رہے تھے، ہم دونوں اس بات پر متفق تھے کہ ۹ اگست کو ہندستان کے مختلف گوشوں میں جو واقعات رُونما ہوئے تھے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دُور رس تھے۔

ہماری قومی تحریک نے ایک نیا موڑ لیا تھا۔ اب تک یہ تحریک مدافعانہ تھی اور اس کی حیثیت ایک مقاومت مجہول سے زیادہ اور کچھ نہ تھی لیکن ۹ اگست کی صبح کو حکومت نے ہندستانی قومیت پر جو اچانک حملہ کر کے بیک وقت تمام ہر دلعزیز قائدین کو بغیر کسی اشتعال کے اچانک نظر بند کر دیا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ تو ضرور ہونا تھا کہ ملک کے طول و عرض میں شدید غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ جائے، لیکن یہ بات شائبۂ خیال میں بھی نہ تھی کہ صدیوں کی "دبی سہمی ہاری ہوئی" قوم ایسے اقدامات پر کمر بستہ ہو جائے گی جن کا تصوّر بھی آج سے دس برس پہلے کے قومی رہنماؤں کو لرزہ براندام کر دیتا۔ ریل کی پٹریاں اُکھاڑی جا رہی تھیں، پُل

توڑے جارہے تھے، لاریاں، بسیں اور ٹرامیں پھونکی جارہی تھیں، دفاتر میں آگ لگائی جارہی تھی، جنگ آزادی کی ساٹھ سالہ تاریخ میں پہلے پہل یہ فلسفہ بروئے کار نظر آرہا تھا کہ طمانچے کا جواب طمانچہ اور صرف طمانچہ ہوسکتا ہے۔

شہر بمبئی کی حالت خصوصیت سے موجب پریشانی تھی کیونکہ اسی شہر سے (شمیم کرہانی کی زبان میں) یہ نعرہ ۸ر اگست کو بلند کیا گیا تھا کہ

چھوڑ دو اے غاصبو ہندوستاں کو چھوڑ دو

اور اسی کی پاداش میں ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران کو گرفتار کرکے کسی نامعلوم جگہ بھیج دیا گیا تھا انھیں خبروں میں یہ خبر بھی تھی کہ گاندھی جی کی گرفتاری کے لئے پولیس اتنے سویرے پہونچ گئی تھی کہ گاندھی جی ابھی نیند سے بیدار نہ ہونے پائے تھے۔

میری اور شمیم کی گفتگو کا سلسلہ شاید کچھ دیر اور قائم رہتا لیکن اتنی ہی دیر میں موسم کا رنگ بدل چکا تھا اور بارش تیز ہوگئی تھی اور شمیم کچھ اس انداز سے گنگنانے لگے تھے جیسے وہ عنقریب برسنے ہی والے ہوں، اور چونکہ میں شمیم کی افتاد مزاج سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ انھیں اس وقت انھیں کے حال پر چھوڑ دوں، کوئی گھنٹہ بھر کے بعد ملازم نے یہ آواز دی کہ کھانا تیار ہے۔ میں نے شمیم کو پکارا تو معلوم ہوا کہ اس وقفے میں انھوں نے ایک نظم تیار کرلی ہے۔

اسی نظم سے اس مجموعے کی ابتدا ہوتی ہے، اس نظم کا عنوان ہے "کچھ دیر"

"کچھ دیر" میں کہیں گاندھی جی کا نام نہیں لیا گیا ہے، لیکن اگر یہ نہ بھی بتایا جائے کہ اس کا تعلق براہ راست گاندھی جی کی ذات سے ہے تو بھی آپ کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ یہ نظم جذباتی ہے، اس میں ایک پُرخلوص

سیاسی کارکن سے زیادہ ایک عزت کرنے والے خادم کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ جیسے شمیمؔ کے سپرد یہ کام رہا ہو کہ گاندھی جی کے آرام کے ان لمحوں میں کسی دوسرے کو دخیل نہ ہونے دیں۔

اس لئے نہیں کہ شمیمؔ گاندھی کی شخصیت سے مرعوب ہیں بلکہ اس لئے کہ شمیمؔ کے محبوب سیاسی مقصد کا "گاندھی" ترجمان ہے۔ شمیمؔ بظاہر ان لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہے جو کبھی کچھ نہ سمجھنے پر تُلے ہوئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نظم کے ہر مصرعے میں اس کے آنسو دیکھے جا سکتے ہیں اور اس کی سسکیاں سُنی جا سکتی ہیں پھر بھی یہ رونا مجبوروں کا رونا نہیں ہے۔ شاعر کو اس بات کا بھی پورا احساس ہے کہ جس موج کو برخود غلط شہنشاہیت اس وقت چھیڑ رہی ہے وہ آگ کا بہتا ہوا دھارا ہے۔

واقعات کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ یہ تحریک جنگل کی آگ کی طرح ہندستان کے کونے کونے میں پھیل گئی، بغاوت برہنہ ہو کر ناچ رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس طوفان میں ساری شہنشاہیت تنکوں کی طرح بہہ جائے گی لیکن بہت جلد حکومت ظلم کی انتہائی پستیوں پر اُتر آئی اور کنکری کا جواب پتھر سے دینے پر تُل گئی۔ شہری اور دیہاتی آبادیوں پر خونخوار فوجی درندے چھوڑ دیئے گئے اور ظلم و تعدی کا وہ بازار گرم ہوا جس نے بربریت کے تمام پچھلے ریکارڈ مات کر دیئے۔ شمیمؔ نے ان واقعات کے ہر پہلو پر سوچا اور غور کیا۔ اس زمانے میں تقریباً روزانہ وہ ایک نظم مکمل کر لیتے اور شام کو جب تمام کاموں سے ہم دونوں فرصت پاتے تو ان نظموں کو سُنتے اور پھر کورس کی طرح گاتے۔ اس وقت

یہ نظمیں طبیعت کا اُبال تھیں، دل کی پکار تھیں اور تعطل اور جمود کے پریشان کُن لمحوں میں تسکین قلب کا ایک سامان تھیں، ہم دونوں میں سے کسی کے ذہن میں اس وقت یہ بات نہ آئی تھی کہ یہ نظمیں کبھی شائع بھی ہو سکیں گی پھر بھی اس خیال سے کہ ان نظموں کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ میں نے شمیمؔ سے یہ بار بار اصرار کیا کہ وہ ان نظموں کو محفوظ کر لیں اور ضائع نہ ہونے دیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آج یہ نظمیں اسی تاکید کی وجہ سے بچ گئیں ورنہ پولیس کے قبضے میں پہونچ کر ان نظموں کا نہ جانے کیا حشر ہوا ہوتا، کیونکہ اُسی زمانے میں پولیس نے میرے مکان پر میری عدم موجودگی میں چھاپا مارا اور تلاشی کے بعد بہت سارے کاغذات سمیٹ کر اپنے ساتھ لیتی گئی، اگر شمیمؔ نے یہ نظمیں ایک دوست کے ہاں محفوظ نہ کرا دی ہوتیں تو گمان غالب ہے کہ یہ نظمیں ضائع ہو چکی ہوتیں۔ غالباً اسی دوستی کے صلے میں یہ فریضہ میرے سپرد کیا گیا ہے کہ مجموعہ کا مقدمہ میں ہی تحریر کر دوں۔

## ترقی پسندی کا جدید رجحان

شمیمؔ کی نظموں کا یہ مجموعہ ہمعصر اُردو ادب میں ایک مخصوص رجحان کا نمایندہ ہے۔ ہمارا جدید ادب آج کل نئے مسائل سے دوچار ہے، ترقی پسندی کی وہ تحریک جواب سے کم و بیش دس برس پہلے شروع ہوئی تھی کثرت تعبیر سے خواب پریشاں بن چکی ہے، ابتدا میں ہماری ترقی پسندی ادب اُردو کے قدیم اور فرسودہ روایات کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی، کیا باعتبار انداز بیان کیا باعتبار خیالات ہر حیثیت سے ہمارے شاعر اور ادیب ایک گھٹتی ہوئی مصنوعی فضا میں سانس

لے رہے تھے۔ غالب، حالی، آزاد اور سب کے بعد اقبال اس محدود حلقے سے نکل کر نئی وسعتوں کی تلاش میں مصروف ہوئے لیکن اقبال کے دور تک ہمیں ہر قدم پر یہ بات محسوس ہوتی رہی ہے کہ چند بندھے ٹکے امور اور حقائق ہیں جن کی نئی نئی شرحیں اور تفسیریں کی جارہی ہیں۔ اس دور کے شاعر اپنے زمانے کی الجھنوں کا احساس تو ضرور رکھتے تھے اور انھیں اچھی طرح سمجھتے بھی تھے لیکن ان کے پاس ان الجھنوں کا کوئی حل نہ تھا، اسی لئے ان کی بیشتر شاعری ایک فرار پسند ذہنیت کا نمونہ ہو کر رہ گئی تھی، الجھنوں کا حل نہ پاکر وہ ماضی کے دامن میں پناہ لیتے تھے لیکن ماضی انکی ذہنی تشفی سے قاصر تھا اسلئے وہ ماضی کے رخساروں پر نئے چمک دار غازے لگاتے۔ اسکے لبوں پر نئی سرخیاں دوڑاتے اور اس کو نیا خوشنما لباس پہنا کے یہ سمجھنا چاہتے کہ زلیخائے ماضی کی جوانی عود کر آئی ہے۔ حال کا بدلنا آسان نہ تھا لیکن ماضی بغیر کسی اندیشے کے بدلا جاسکتا تھا اس لئے وہ اپنے تصور میں اس ماضی کو بدلتے اور عظیم الشان روایات کی آنکھوں سے محبت بھرے انداز میں جب اُس کی طرف دیکھتے تو انھیں ایسا محسوس ہوتا کہ موجودہ اُلجھنوں کا یہی ایک حل ہے لیکن اس کا دوسرا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ اپنی حقیقت پسندی کے باوجود مابعد الطبعیاتی میدانوں میں پہونچ کر کھو جاتے۔ اور جیسے ہی ماضی کے اس حسین چہرے سے ان کی نگاہیں ہٹتیں حقیقت کی ڈراؤنی اور بھیانک شکلیں پھر سامنے آجاتیں، لیکن ان شکلوں کو آنکھ بھر کر دیکھنے کی سکت ان میں نہ تھی اس لئے وہ ان سے آنکھیں چُراتے اور فرار کے کسی نہ کسی راستے پر جاپڑتے، اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا کیوں کہ ان کا رابطہ عوامی تحریکوں سے تھا ہی نہیں، طبقاتی جنگ کے جدلیاتی ارتقار پر انھیں یقین کیونکر

ہو سکتا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں جب قومی جماعتوں نے مختلف صوبوں میں زمام حکومت سنبھالی تو طبقاتی جنگ کی رفتار بھی تیز ہوئی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سوچنے والے بھیانک حقیقتوں سے فرار کرنے کے بجائے ان سے دست و گریباں نظر آنے لگے اس جنگ میں موجودہ اُلجھنوں کا حل مل گیا، اس لئے ہمارے شاعر اور ادیب جن کے بارے میں اقبال کو یہ شکایت تھی کہ "آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار" وہ حُسن و عشق، حیات و موت، تصوف اور ما بعد الطبعیاتی حقائق کی تنگنائے سے نکل کر مزدوروں اور کسانوں کی ڈراؤنی گندی اور ایک نا معلوم آگ میں تپتی ہوئی بستیوں کی طرف آ گئے۔

## عوامی جنگ کیوں؟

ہمارے ادب میں مزدور، کسان، غریب، افلاس، بغاوت، آندھی، انگارا، خون، انقلاب کی طرح کے سیکڑوں نعرے بیک وقت اکٹھا ہو گئے لیکن سوائے اُن چند شاعروں کے جن کا تعلق عوامی تحریکوں سے گہرا تھا ان نعروں کو بھی حقیقتوں سے فرار کا ایک ذریعہ بنا لیا گیا۔ اسی وقت سے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی　　اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

جب کسی نئی تحریک کی ابتدا ہوتی ہے تو اہل و نا اہل بے غرض و خود غرض پُرخلوص و ریاکار اکثر و بیشتر یکجا ہو جاتے ہیں کچھ بازار کا بھاؤ چڑھتا ہوا دیکھ کر اپنی دوکان سجاتے ہیں اُن کا مقصد خریداروں کی ضرورتوں کا پورا کرنا نہیں بلکہ اپنے مال کی نکاسی ہوتا ہے کچھ ایسے ہی خود غرض نعرہ فروش بزم ادب میں بھی شامل ہو گئے تھے

اور یہ چاہتے تھے کہ شور و شغب برپا کر کے پرکھنے والوں کا معیار بدل دیں۔ انھیں وقتی طور سے کامیابی بھی ہوئی کیوں کہ جن لوگوں کو غور و خوض کی عادت نہیں تھی وہ ان کے نعروں ہی کو حقیقت سمجھ بیٹھے لیکن یہ حالت زیادہ دنوں قائم نہ رہ سکی جب تک ترقی پسندی کے شعور کا بچپن تھا ہر نئی چیز کھلونے کی طرح خوشنما نظر آتی تھی اور ہم اس کھلونے سے کھیلتے تھے۔

رفتہ رفتہ شعور بڑھتا گیا اور حالات بدلتے گئے۔ داستان حسن و عشق سے صدیوں کا رابطہ دو ایک دن میں ختم نہیں کیا جا سکتا، اور نہ یہ ختم کرنے کی چیز ہی ہے لیکن دشواری یہ آن پڑی تھی کہ داستان محبت اتنی پرانی ہو گئی تھی اور ہندستان کے مخصوص حالات نے ہمارے ادب میں بحیثیت مجموعی اس داستان کو ایک ایسی ثانوی حیثیت دے دی تھی کہ اس میں کوئی خاص کشش باقی نہ رہ گئی تھی، جن شاعروں اور ادیبوں کا تعلق عوامی تحریکوں سے تھا انھیں تو اس طرف نظر کرنے کی فرصت ہی نہ تھی لیکن جو لوگ اب بھی تخیل کے گھروندے بنانے میں مشغول تھے ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ اس آڑے وقت میں فرائڈ، یونگ اور ایڈلر کے غیر منہضم نظریے کم ظرف ادیبوں اور شاعروں کے فرار کا ایک نیا ذریعہ بن گئے۔ یہ بتانا کہ جذبۂ جنسی ایک فطری جذبہ ہے اور محبت اسی جذبے کی تابع لیکن "اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا" بلکہ ایسے دکھ ہیں جن کے آگے محبت کا تذکرہ مضحکہ انگیز ہو جاتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ داستان محبت دہرانے کی چیز نہیں لیکن حسن و عشق کے افسانے کو اس سے زیادہ اہمیت دینا جس کا وہ زندگی کے دوسرے حقائق کے مقابلے میں مستحق ہے زیادتی ہوگی۔ بدقسمتی سے ہمارے ادب میں

حسن و عشق کے سودائیوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جس کی جنسی بھوک سیاسی انتقام کی شکل اختیار کرتی ہے اور جنسی گندگیوں کا تذکرہ طبی اصلاح پسندی کا لباس پہن لیتا ہے، بہر کیف اس وقت ترقی پسند ادب کے ان دونوں بے راہرو گروہوں سے کوئی سروکار نہیں لیکن ان دو گروہوں کے علاوہ ترقی پسند ادیبوں کے حلقے میں سیاسی اختلافات کی بنا پر دو واضح گروہ اور بھی بن گئے ہیں، اس سیاسی گروہ بندی کی تاریخ کچھ زیادہ طویل نہیں ۱۹۴۱ء سے پہلے یہ گروہ بندی کچھ زیادہ واضح نہ تھی لیکن ۱۹۴۱ء میں جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا تو ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے یہ عجیب و غریب نعرہ بلند کیا کہ یہ جنگ ہندوستان میں بھی عوام کی جنگ ہو گئی جو ہندوستان اپنی مرضی کے خلاف اس جنگ میں گھسیٹا گیا تھا یہ جنگ اس کے عوام کی کیونکر ہو سکتی تھی؟ اسکے علاوہ اگر ہندوستان میں قومی حکومت ہوتی یا کم از کم اس جنگ کے چلانے میں یا جنگ کی پالیسی کی ترتیب میں ہندستانی عوام کو کوئی دخل ہوتا تو بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ جنگ عوامی جنگ ہے، روس اور چین کے حالات مختلف تھے وہاں جنگ کے مسئلے میں عوام اور حکومتوں میں کوئی اختلاف نہ تھا وہاں یہ جنگ عوام کے مفاد کے لئے لڑی جا رہی تھی خارجی حملہ آوروں کا دفاع اور اپنا گلا گھونٹنے والی شہنشاہیت کی جڑوں کو اپنے خون سے سینچ سینچ کے مضبوط بنانا ان دونوں میں جو تضاد ہے وہی تضاد روسی عوام اور ہندوستانی عوام کے نقطۂ نظر میں بھی تھا، یہاں کی فوجیں روپئے اور جبر کے اشاروں پر چلتی تھیں روسی عوام اپنے خون سے بچتے ہوئے انقلاب کی حفاظت کے جذبے میں سرشار ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ہندستان اپنی تمام بین الاقوامی ہمدردیوں کے باوجود یہ کیونکر بھول سکتا تھا کہ

وہ آپ ابتک غلام ہے، اس سے جب یہ کہا جاتا کہ یہ جنگ آزادی اور جمہوریت کے لئے لڑی جارہی ہے تو اس کی آنکھوں میں برطانوی شہنشاہیت کا نقشہ پھر جاتا اس کے لئے فسطائیت اور شہنشاہیت میں ظلم و تعدی جزو مشترک نظر آتی، درجوں کا فرق کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا۔ وہ سب سے پہلے اس جوے کو اُتار پھینکنا چاہتا جو صدیوں سے اس کی گردن کو بُری طرح دبائے تھا۔ کمیونسٹ پارٹی اپنی نظریاتی مصلحت کے مطابق اس نازک موقع پر بھی خاموش تماشائی بنی رہی۔

# اگست کا انقلاب

ایک ہی سال کے بعد واقعات نے ایک اور امتحان گیر پلٹا کھایا اور اُس عظیم الشان تحریک کا آغاز ہوا جو تاریخ میں "اگست انقلاب" کے نام سے موسوم ہے۔ اس زمانے میں ظلم و تعدی کا وہ طوفان اُٹھا کہ سیکڑوں بچے یتیم، سیکڑوں مائیں لاوارث، سیکڑوں عورتیں بیوہ ہوگئیں، لاتعداد انسان صرف اس بنا پر خاک و خون میں غلطاں نظر آئے کہ اُنھوں نے آزادی کا نعرہ بلند کیا، ہمارے کمیونسٹ دوستوں کا اس موقع پر جو رویہ رہا اُس کو شمیمؔ نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے ؎

آبرو کا چاند جب آشوب کے ہالوں میں تھا
اپنا بھائی بھی تماشا دیکھنے والوں میں تھا

یہی نہیں بلکہ اس جماعت نے آزادی کے ان پروانوں کو جو سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے غدّار کہا" ففتھ کالمنسٹ" کہا۔ وطن فروش کہا۔ اُلٹے چور کوتوال کو ڈانٹ رہا تھا۔ اس جماعت کے ادیبوں اور شاعروں کے نزدیک اس زمانے میں ہندستان کی آزادی و غلامی کا تذکرہ کرنا ناقابل عفو جرم تھا۔ ان کے تنقید نگاروں نے یہ معیار بنالیا تھا

کہ جو اس جنگ کو عوام کی جنگ نہیں مانتا اور جو اگست والے انقلاب کا نام سن کر منہ سے آگ نہیں تھوکنے لگتا وہ ترقی پسند نہیں ہو سکتا بلکہ وہ پرلے سرے کا رجعت پسند ہے۔

دوسرا گروہ وہ تھا جو عوام کی اگست والی تحریک سے عملی و ذہنی طور پر وابستہ تھا۔ وہ بین الاقوامی جنگ کے پس منظر میں اپنے آزاد مستقبل کے تصور کو ترک کرنا نہیں چاہتا تھا وہ اپنی غلامانہ زندگی سے کسی شرط پر بھی سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں تھا۔ ملک کا بڑھتا ہوا افلاس، بھوک، فاقہ، قحط اور سب پر مستزاد سیاسی بے بسی، سرمایہ داروں کا تشدد، مطلق العنان زمینداروں کا ظلم، سب مل کر اس کے دماغ میں سوئیاں چبھو رہے تھے اور اس کے احساسات کو اکسا رہے تھے۔ اس کی بین الاقوامیت اس کی قومیت پہ نازاں تھی، وہ سمجھتا تھا کہ یہ دوسری جنگ عظیم بھی مستقل امن کی پیامبر اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک دنیا سے غلامی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ نہ کر دیا جائے اور بعد کے واقعات نے یہ ثابت کیا کہ ایسا سوچنے میں وہ بالکل حق بجانب تھا، ہندستان کی آزادی کا مسئلہ تمام دنیا کے دبے اور کچلے ہوئے عوام کے مسئلے سے اس طرح وابستہ تھا کہ دونوں کا جدا کرنا ناممکنات سے تھا، نتیجہ ظاہر تھا عوام پر کمیونسٹ پارٹی کا رہا سہا اقتدار بھی رخصت ہو گیا اور وہ ہندستانی سیاسیات کے سمندر کے کنارے گھونگھے جمع کرنے میں مصروف ہو گئے لیکن آخر الذکر گروہ درمیانِ قعرِ دریا تختہ بند ہونے پر بھی مسرور تھا کہ ؎

حیات کو شرار پہ تپا رہی ہے زندگی
ہری بھری جوانیاں جلا رہی ہے زندگی
ستارے توڑ توڑ کر لٹا رہی ہے زندگی
بنے ہوئے ہیں جشنِ قتل گاہ کی بہار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم (شمیم)

# شمیم کی شاعری

شمیم اسی آخری گروہ کا نمائندہ ہے، اس کی شاعری میں اسی وجہ سے خلوص ہے، جان ہے، پائندگی ہے ۔ ۴۲ء کی نظموں میں شمیم کا موضوع سخن اس کے دل اور اس کی نگاہوں سے بہت قریب ہے ۔ شمیم کا وطن اعظم گڈھ کے ضلع میں ہے اور یہ وہ ضلع ہے جس نے گزشتہ تحریک میں بلیا اور غازی پور کے بعد سب سے نمایاں حصہ لیا، اور غازی پور میں شمیم کا ننہال ہے اس وجہ سے وہاں کے حالات بھی اسے اچھی طرح معلوم ہیں، جن صوبوں میں یہ تحریک نسبتاً کمزور تھی وہاں کے شاعروں اور ادیبوں کے لئے یہ محسوس کرنا آسان نہ تھا ۔

خونی کالا، طوفاں آیا
بیڑے ناچے، پل تھرایا
پل کے دامن خون سے چھلکے
گردابوں میں لاشے جھلکے

اندھو، مست آنسو ٹپکاؤ
ناچو گاؤ، دھوم مچاؤ

یا

یہ رات، یہ بن، یہ سناٹا، یہ دیس کے اندھے پروانے
اینٹوں پہ کدالیں بجتی ہیں، پل توڑ رہے ہیں دیوانے
تنگ آ کے غلامی سے انساں، زنداں ہی کو ڈھانے والا ہے
دیوار سے طوفاں ٹکرا کر اک راہ بنانے والا ہے

یا

یہ فوج کی لاری جاتی ہے

شہروں میں گھنا سناٹا ہے، گاؤں پہ اُداسی چھائی ہے
اک زندہ دلوں کی سینا ہے جو موت کے آگے آئی ہے
جو لوگ بڑے دھن والے ہیں، بیٹھے ہیں چھپے کاشانوں میں
یہ چند بہادر نکلے ہیں، چالیس کرور انسانوں میں
چالیس کرور انسانوں کی غیرت کو مٹانے جاتی ہے
یہ فوج کی لاری جاتی ہے

یہ سارے واقعات اور حادثات اخبارات اور رسائل میں مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں اسلئے اس موقع پر ان کی مزید تشریح کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور شمیم کی نظموں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ یہ تمام واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔

بادی النظر میں شمیم پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اُن کی بعض نظموں کا انداز خطیبانہ ہے لیکن اس کا ایک سبب ہے اور وہ یہ کہ شمیم نے یہ نظمیں اُس وقت لکھی تھیں جب کہ ۴۲ء کی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ اس وقت ان واقعات کو دیکھ کے انسانوں کا خون کھولنے لگتا تھا اور دماغی توازن تک برقرار نہ رہتا تھا۔ ایسے عالم میں شمیم کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ گوشہ نشین آدمیوں اور شاعروں کی طرح صناعیاں کرتے اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتے یہ تو ایسے لمحات ہیں جب خیالات اور جذبات منطق سے بھی بے نیاز ہو جایا کرتے ہیں، لیکن ان

حالات میں بھی شمیم کی نظر برابر واقعات کے منطقی نتائج پر رہی ہے مثلاً جب باغی پلوں کو توڑتے ہیں اور ایک دیوانہ وار کوشش میں مصروف ہوتے ہیں تو شمیم کو بے انتہا خوشی ہوتی ہے، اسے زندانِ غلامی مسمار ہوتا ہوا نظر آتا ہے لیکن بہت جلد اُس کی نظر نتیجے پر پہونچ جاتی ہے اور کہتا ہے کہ ؎

مانا کہ مکمل آزادی پُل ڈھا کے نہیں مل جائے گی
مغرب کے سہانے محلوں کی بنیاد مگر ہل جائے گی

اگر شمیم نے یہ نظمیں کچھ دنوں بعد لکھی ہوتیں تو شاید باعتبارِ فن اُن میں گُل بوٹے بنانے کی زیادہ گنجائش ہوتی عمل کی ہماہمی میں باتیں بنانے کا موقع کہاں۔

## حسین روایات کا نیا سانچا

اس خلوص اور گرم جوشی کے علاوہ کئی صفتیں ان نظموں کو ممتاز بناتی ہیں شمیم نے اُردو کے ادبی ماضی کے حسین روایات کو ضروریاتِ زمانہ کے سانچے میں ڈھالا ہے اور ہندی لفظوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ انھوں نے اپنی نظموں میں اس طرح سمویا ہے کہ زیرِ نظر مجموعہ ایک میٹھا اور پُرجوش ترانہ معلوم ہوتا ہے، اُن کی زبان رسیلی اور اندازِ بیان دل آویز ہے۔ ان کے اندازِ فکر میں کوئی پیچیدگی یا اُلجھاؤ نہیں ہے بلکہ مقصد کے اعتبار سے فن کارانہ وضاحت ہے۔

کچھ نظمیں اس مجموعے کے آخر میں ایسی بھی ہیں جو براہِ راست ۴۲ء کی تحریک سے متعلق نہیں ہیں لیکن انھیں ۱۹۴۲ء کی نظموں کا تتمہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ اس قومی تحریک کی آگ کو ہوا دینے والی ایک اور تحریک بھی تھی جو ہندستان کے

باہر جاری تھی اور جس کا کارنامہ آزاد ہند فوج کا قیام ہے۔ اسی طرح سنہ ۴۲ء کے دل جلانے والے واقعات کے فوراً بعد انسان کا عائد کردہ قحط صوبہ بنگال پر نازل ہوا۔ جس میں ہزاروں لاکھوں جانیں صرف حکومت کے ناکارہ پن کی وجہ سے ضائع ہوئیں۔ قحط بنگال کو خصوصیت سے کمیونسٹ ادیبوں اور شاعروں نے منتخب کیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پر کوئی ادیب کرشن چندر کے "ان داتا" سے بہتر کوئی شاہکار پیش نہ کر سکا۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ شمیم کی نظم "گنگا کے دھارے" سے بہتر کوئی دوسری نظم اس موضوع پر نہیں کہی گئی۔ مگر لطف یہ ہے کہ شمیم اور کرشن چندر دونوں کمیونسٹ نہیں ہیں۔

شمیم کے اس مجموعے کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیئے لیکن اس مجموعہ سے ان کی شاعری کی عظمتوں کا مکمل اندازہ نہیں لگایا جا سکتا یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ ان نظموں کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ ان کا سارا ڈھانچہ سنہ ۴۲ء کی سیاسی تحریک کے نشیب و فراز سے تیار ہوا ہے۔ اس لئے یہ نظمیں مخصوص انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ان کا مقصد ہندستان کی تحریک۔ آزادی کے ایک ہنگامہ خیز دَور کی محاکات ہے۔ یہ نظمیں ایک خاص ذہنی کیفیت، قلبی بے چینی اور قومی جوش و خروش کی آئینہ دار ہیں۔ ان کو شمیم کی کائنات شاعری سمجھنا صحیح نہ ہوگا۔ شمیم ایک حساس فن کار ہیں اور اپنے دَور کے مقتضیات سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی شاعری میں گہری ہے اور ان کی نظمیں علی العموم گہرے تفکر، سنجیدہ گفتاری اور دَورِ حاضرہ کے فنی اجتہادات کی علمبردار ہیں۔

مجھے امید ہے کہ شمیم کا یہ مجموعہ سنہ ۴۲ء کی تحریک کی طرح یادگار رہے گا۔

# کچھ دیر

کچھ دیر ذرا سو لینے دو

تم جیل جسے لے جاتے ہو، وہ درد کا مارا ہے دیکھو
مظلوم، اہنسا کا حامی، بے بس، دکھیارا ہے دیکھو
بیچین سا اُس کی آنکھوں میں، پچھلے کا تارا ہے دیکھو

کچھ دیر ذرا سو لینے دو

آیا ہے عمل کی وادی سے، دن بھر کا تھکا ماندا ہارا
افکار کے کانٹوں کا چھیڑا، آلام کی آندھی کا مارا
وہ جلتی ریگ تھی صحرا کی، لیٹا بھی نہیں ہے دکھیارا

کچھ دیر ذرا سو لینے دو

کچھ خاک پڑی ہے ماتھے پر، کچھ گرد جمی ہے بالوں میں
تشویش کی نیلی شکنیں ہیں، سنولائے ہوئے سے گالوں میں
ٹھنڈک بھی نہیں آنے پائی، تلووں کے تپکتے چھالوں میں

کچھ دیر ذرا سو لینے دو

افلاس کے رُخ پر آب کہاں، غربت کی نظر میں تاب کہاں؟
پلکوں میں جو بھر دے مست کرن، آکاش پہ وہ مہتاب کہاں؟
مانا کہ غلام آنکھوں کے لئے، آزاد خوشی کا خواب کہاں!
کچھ دیر ذرا سُو لینے دو

زنداں کی بھیانک راتوں میں، جو ظلم پڑے سہنا ہو گا
طوفانِ ستم میں، ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح بہنا ہو گا
آزاد گھڑی کی حسرت میں، بے خواب اسے رہنا ہو گا
کچھ دیر ذرا سُو لینے دو

ہم اُس کے عزیز سپاہی وہ سردار ہمارا ہے سُن لو
کُل ہند فدا ہے اُس پر وہ کُل ہند کا پیارا ہے سُن لو
جب موج کو چھیڑ رہے ہو تم، وہ آگ کا دھارا ہے سُن لو
کچھ دیر ذرا سُو لینے دو

ہم تم کو بتائے دیتے ہیں، اک روز بہت پچھتاؤ گے
مظلوم کے ہونٹوں پر جب دم، بندش کی مُہر لگاؤ گے
وہ شور اُٹھے گا ہر دل سے، اُس شور میں گُم ہو جاؤ گے
کچھ دیر ذرا سُو لینے دو

۱۰ اگست ۱۹۴۲ء

# طوفان

لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا
تھی آس ہمیں جس طوفاں کی، لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا
مظلوم کی آہوں کا بادل، ظالم کے جہاں پہ چھا ہی گیا
پربت سے راس کماری تک، خونیں پرچم لہرا ہی گیا
لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

سوئی ہوئی ہلچل جاگ اُٹھی، مجبور کے دل کی آہ لئے
کھوئی ہوئی بجلی کوند پڑی، مزدور کی تلخ نگاہ لئے
انساں کا ستم سہتے سہتے، انسان کا دل گھبرا ہی گیا
لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

مُدت سے فضا چپ چپ سی تھی، آخر کو وہ سناٹا ٹوٹا
سینوں سے نیا کہرام لئے، جذبات کا فوّارا چھوٹا
اک خون کا بادل لہرایا، لہرا کے لہو برسا ہی گیا
لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

ہنگامہ و شر کے ساغر میں، تسکین و اماں کی مے لے کر
اک زہر سے دھوئے پیالے میں، امرت سی گلابی شے لے کر
وہ کالا ناگ بغاوت کا، بانبی سے نکل کر آ ہی گیا
لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

اُو مست جوانی! دیر نہ کر، بڑھ اور قدم لے طوفاں کے
یہ سیلِ تباہی سینچے گی، سوکھے ہوئے گلشن انساں کے
جو سُکھ کا سویرا لائے گا وہ دُکھ کا اندھیرا آ ہی گیا
لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

(۱۱ اگست)

# جاگا ہندستان

جاگا ہندستان رے ساتھی جاگا ہندستان

آج مرے باغی مُطرب نے چھیڑ دیے وہ تار
ڈوب گئی سنسار کے دل میں تار کی ہر جھنکار
گونج اٹھے سب دریا جنگل، بولے کوہستان
جاگا ہندستان رے ساتھی جاگا ہندستان

بجلی بن کر سُرخ فضا میں، کوندرہے ہیں راگ
ناگن بن کر گرم ہَوا میں، جھوم رہی ہے آگ
آگ وہ جس کی لَو میں ناچے، متوالوں کی جان
جاگا ہندستان رے ساتھی جاگا ہندستان

اور مچے ہلچل دنیا میں، اور پڑے کُہرام
لُوٹ لیں بڑھ کر میخانوں کے سُرخ چھلکتے جام
کب تک خون کی شبنم چاٹے، ہر پیاسا ارمان
جاگا ہندستان رے ساتھی جاگا ہندستان

مست اُمنگوں کا دَل بادل، جھوم چلا چو اُور
لے کے لہو کی گہری لالی، چھائی گھٹا گھنگھور
نور کی چھاگل چھلکا دے گا، یہ کالا طوفان
جاگا ہندستان رے ساتھی جاگا ہندستان

۱۲؍ اگست

# فوجی لاری

یہ فوج کی لاری جاتی ہے
میدان میں ہمت کے پُتلے ، تیار کھڑے ہیں مرنے کو
اک قوم دبی کچلی ہاری ، پستی سے تُلی ہے اُبھرنے کو
ہر جسم " زرہ " سے بے پروا ، ہر ہاتھ " تبر " سے خالی ہے
آنکھوں میں نشہ ہے مرنے کا ، چہروں پہ خوشی کی لالی ہے
ان موت سے لڑنے والوں کو " تلوار " ڈرانے جاتی ہے
یہ فوج کی لاری جاتی ہے
شہروں میں گھنا سناٹا ہے ، گاووں پہ اُداسی چھائی ہے
اک زندہ دلوں کی " سینا " ہے جو موت کے آگے آئی ہے
جو لوگ بڑے دھن والے ہیں ، بیٹھے ہیں چھپے کاشانوں میں
یہ چند بہادر نکلے ہیں ، چالیس کرور انسانوں میں
چالیس کرور انسانوں کی غیرت کو مٹانے جاتی ہے
یہ فوج کی لاری جاتی ہے

چھوٹی سی جماعت ہے لیکن جب گھاؤ جگر پہ کھائے گی
جو بوند لہو کی ٹپکے گی وہ بوند چمن بن جائے گی
ان "زندہ گھروں" کی بربادی پیغام ہے اک آبادی کا
اِن کے ہی لہو سے اُبھرے گا، رنگیں پرچم آزادی کا
خود موت "ہماری ہستی" کا پرچم لہرانے جاتی ہے
یہ فوج کی لاری جاتی ہے

(۱۳؍اگست)

# ماں! کس لئے روتی ہے تو؟

ماں! کس لئے روتی ہے تو
یہ موت کیا، یہ لاش کیا
یہ تیرے دل کی قاش کیا
شہرت ہے تیرے "لال" کی
دھومیں ترے اقبال کی
صحرا بصحرا، کو بکو
ماں! کس لئے روتی ہے تو

یہ موت اک احسان ہے
ہندوستاں کی آن ہے
اک فخر تازہ بن گیا
چہروں کا غازہ بن گیا
یہ تیرا خونِ آرزو
ماں! کس لئے روتی ہے تو

یہ تیرا البیلا جواں
روئے زمیں کی کہکشاں
کشتی کو خوں میں کھے گیا
لیکن چمن کو دے گیا
اک جاودانی رنگ و بو
ماں! کس لئے روتی ہے تو

اونچا ہوا مشرق کا سر
تو فخر کر، تو ناز کر
دنیا کی خدمت کے لئے
قومی عبادت کے لئے
خوں سے کیا اس نے وضو
ماں! کس لئے روتی ہے تو

یادِ شہیدانِ وفا
دل میں رہے گی یوں سدا
دامن میں نخلستان کے
سینے میں کوہستان کے
جیسے رواں ہو آبجو
ماں! کس لئے روتی ہے تو

پھل صبر کا ، بل جائے گا
دل کا کنول کھِل جائے گا
خوں "وقت" برسانے کو ہے
طوفان ، بن جانے کو ہے

یہ بے گُناہی کا لہو
ماں ! کس لئے روتی ہے تو

(۱۵ اگست)

# پرچم نہ جھکانا

وہ خون میں ڈوبا ہوا پرچم جو پڑا ہے
کہتا ہے کسی مست کی ہمت کا فسانہ
سودائی کو یہ دُھن تھی کہ لہرا کے رہیں گے
ہر چند سمجھتا تھا، مخالف ہے زمانہ
پرچم کو جو لہرا کے بڑھا، تان کے سینہ
سینے کو کیا ظلم کی گولی نے نشانہ
پرچم کو لئے جھومتا بڑھتا ہی گیا وہ
ہر چند کہ اندھیر تھا آنکھوں میں زمانہ
ہر گام پہ دیتی تھی صدا مست جوانی
ساونت! بڑھے پاؤں نہ پیچھے کو ہٹانا
یوں چند قدم بڑھ کے گرا جھوم کے جانباز
جس طرح گرے شیر کوئی ہو کے نشانہ

گو مردِ جری مُنہ سے لہو تھوک رہا تھا
ہونٹوں پہ مگر تھا یہ جوانی کا ترانہ
ہو ظلم کی آندھی سے زمانہ تہ و بالا
پر قوم کا پرچم نہ جھکانا نہ جُھکانا
وہ خون میں ڈوبا ہوا پرچم جو پڑا ہے
کہتا ہے کسی مست کی ہمّت کا فسانہ

(۱۶ اگست)

# جنگل کی آگ

خاک پہ جو شبنم کا قطرہ، چمن کے شجر سے ٹپکا ہے
شام کا تارا آنسو بن کر، چشمِ سحر سے ٹپکا ہے

مست بگولے جھوم کے اُٹھے، صحرا کے میخانوں سے
کون کرے اب ہوش کی باتیں، بے قابو دیوانوں سے

گر کے زمیں پر لَو دے اُٹھا، گرم لہو ارمانوں کا
کر ہی گیا صحرا میں چراغاں، خونِ جگر دیوانوں کا

وقت کے اونچے اونچے محل کیوں، رزم کی دعوت دیتے ہیں
دل کی دہکتی آگ کے شعلے، تاروں کو چھو لیتے ہیں

ظلم پہ مظلوموں کی "شورش" دھوم مچاتی جائے گی
اس جنگل کی آگ کو "آندھی" اور بڑھاتی جائے گی

(۱۷ اگست)

# بجتی ہوئی کُدالیں

یہ رات، یہ بن، یہ سناٹا، یہ دیس کے اندھے پروانے
اینٹوں پہ کُدالیں بجتی ہیں، پُل توڑ رہے ہیں دیوانے
پتھر پہ جو لوہا پڑتا ہے، پڑتے ہی شرارے اُڑتے ہیں
تاریک فضا کے دامن میں، رنگین ستارے اُڑتے ہیں
اللہ! یہ کیسے بندے ہیں، بیزار خود اپنی ہستی سے
موت آنکھ کے آگے رقصاں ہے، دل جھوم رہے ہیں مستی سے
تنگ آ کے غلامی سے انساں، زنداں ہی کو ڈھانے والا ہے
دیوار سے طوفاں ٹکرا کر، اب راہ بنانے والا ہے
گو اِن کے لہو سے پچھلے تک، اِس پُل کے گڑھے بھر جائینگے
جیتے نہ بچیں گے دیوانے، پر کام بڑا کر جائیں گے
مانا کہ مکمل آزادی، پُل ڈھا کے نہیں مِل جائے گی
مغرب کے شہانے محلوں کی بنیاد مگر ہل جائے گی

(۱۹ر اگست)

# شوخ اُجالا

آنے والے دن کے مُنہ پر ایک دُھندلکا چھایا ہے
گہرے گہرے رنگ کے اوپر ہلکا ہلکا سایا ہے
سرد فضا میں ہلکے تارے، ٹھنڈی رنگت بھرتے ہیں
دُھندلی دُھندلی تاریکی میں، جھلمل جھلمل کرتے ہیں
اور اس دُھندلے "پس منظر" میں ایک سپاہی جاتا ہے
جیسے افق کا سیمیں پرچم، کُہرے میں لہراتا ہے
جانے والا اپنے گھر کا تنہا راج دُلارا ہے
پھر بھی کفن باندھے نکلا ہے، ماں نے رن سے پکارا ہے
بھائی بہنیں دیکھ رہے ہیں، بستی کے ہر مسکن سے
ماں کا آنسو جھانک رہا ہے، دروازے کی چلمن سے
ذرّہ ذرّہ کانپ رہا ہے، اِس پُر ہول ارادے پر
وہ بیخوف چلا جاتا ہے، قربانی کے جادے پر

پیچھے مُڑ کر کیا دیکھے وہ، پیچھے مایا ماتا ہے
آگے ظلمت کی چھاتی میں، دیپک سا لہراتا ہے
کھینچ رہی ہے ظلمت کھینچے، جیل کی کالی دُنیا میں
شوخ اُجالا کھیل رہا ہے، اُس کی خیالی دُنیا میں

(۲۰، اگست)

# پاک ہولی

زندگی، پرچم نیا، لہرا گئی
رات کے بالوں کی افشاں اُڑ گئی
ماہ و انجم کی کلائی مُڑ گئی

خون میں ڈوبی ہوئی پھوٹی کرن
سر سے باندھا نوجوانی نے کفن

مَوت، حسن زندگی دکھلا گئی
زندگی پرچم نیا لہرا گئی

رس بنی خوشبو، فضا چھاگل ہوئی
موجِ گُل ناچی، ہوا پاگل ہوئی
آندھیوں کی تال پر ناچا جنوں
آگ کے پرچم سے جھلکی مَوجِ خوں
دل جلوں کی پاک ہولی آگئی
زندگی، پرچم نیا لہرا گئی

تھم کے دھارے خون کے ، خنجر بنے
جم کے آنسو، ناوک و نشتر بنے
بن گئیں آہیں جہنّم کا جلال
وقت کے مظلوم نے تولی کدال
شیش محلوں کی بنا تھرا گئی
زندگی پر چم نیا لہرا گئی

(۲۲ ر اگست)

# شاعر کا سلام

کفن بدوش، سرِ قتل گاہِ آزادی
وہ، سرفروش کھڑے ہیں پرا جمائے ہوئے
تُلے ہوئے ہیں نہ معلوم کس ارادے پر
نشاں اُٹھائے ہوئے، آستیں چڑھائے ہوئے
لبوں پہ شور کہ "پیچھے نہ پاؤں سرکانا"
دلوں میں جوش کہ آگے قدم بڑھائے ہوئے
بڑھے چلو یونہی دُنیا کے اُس کنارے تک
زمیں کو گھیرے ہوئے، آسماں کو چھائے ہوئے
دہانِ توپ سے گولے برسنے والے ہیں
یہ بے ہراس کھڑے ہیں قدم جمائے ہوئے
وہ کمسنوں میں جوانوں کا جوش پیدا ہے
کہ فوجیوں کی جوانی ہے سر جھکائے ہوئے

دلوں سے شور اُٹھا، "انقلاب زندہ باد"
بڑھے غلام، غلامی سے تنگ آئے ہوئے
ملا وہ حکم، گنوں سے وہ گولیاں برسیں
گرے جوان کلیجوں پہ گھاؤ کھائے ہوئے

سلام ہند کے شاعر کا، اُن شہیدوں کو
پڑے ہیں خاک پہ جو خون میں نہائے ہوئے

(۲۳ر اگست)

# سیاہی کا رقص

گر کے لہو میں لاشیں ناچیں
دل کی، جگر کی قاشیں ناچیں
پھوٹے دل کے چھالے پھوٹے
خون بھرے فوّارے چھوٹے

دیوانو! ساغر چھلکاؤ
ناچو گاؤ، دھوم مچاؤ

دریا ناچے، دھارے ناچے
جگنو ناچے، تارے ناچے
مقتل جھومے، قاتل جھومے
خنجر جھومے، بسمل جھومے

جھومو، تھرکو، ساون گاؤ
ناچو گاؤ، دھوم مچاؤ

اُمڈے فوجوں کے دَل بادل
جاگی خون کی پیاسی ہلچل
تاروں کی پلکیں وہ جھپکیں
ٹپکیں خون کی بوندیں ٹپکیں

متوالو، امرت برساؤ
ناچو گاؤ، دھوم مچاؤ

خونی کالا، طوفاں آیا
بیڑے ناچے، پُل تھرّایا
پُل کے دامن خون سے چھلکے
گرد ابوں میں لاشے جھلکے

اندھو، مست آنسو ٹپکاؤ
ناچو گاؤ، دھوم مچاؤ

ہم متوالے، ہم البیلے
اپنے لہو کی ہُولی کھیلے
اور ابھی ہولی کھیلیں گے
خون کا اک دریا جھیلیں گے

وحشت کا پرچم لہراؤ
ناچو گاؤ، دھوم مچاؤ

(۲۴ر اگست)

# ہلکی سی کرن

سنسار کے ہم سب ہیں، سنسار ہمارا ہے
اِس باغ کا ہر بوٹا، آکاش کا تارا ہے

اک روز پکارے گی، مظلوم کی "بجے" دُنیا
جو ظلم سے جیتا ہے، جیتا نہیں ہارا ہے

اللہ کو بندوں نے، بدنام کیا ناحق
انسان کو دنیا میں، انسان نے مارا ہے

پربت کے کلیجے سے، بہتا ہے لہو ابتک
گنگا جسے کہتے ہیں، اک خون کا دھارا ہے

ہے رات کے سینے میں، ہلکی سی کرن اب بھی
اس ڈوبتے بیڑے کو، تنکے کا سہارا ہے

(۲۵ر اگست)

# "اِنسان" یا "سونا"

گوروں کا رسالہ بستی میں، جب آگ لگاتا چلتا تھا
عیسیٰؑ کے پجاری ہنستے تھے، آدم کا نشیمن جلتا تھا
وہ جلتی چھتوں کے گرنے سے، پُرہول دھماکے ہوتے تھے
ماؤں کی دھڑکتی چھاتی سے، چمٹے ہوئے بچے روتے تھے
انسان کی عصمت پر جس دم، لالچ کی کمان کڑکتی تھی
حوّا کا کلیجہ دُکھتا تھا، مریم کی روح پھڑکتی تھی
جب آگ بُجھانے کو انساں، پانی کے لئے جاں کھوتے تھے
تب سات سمندر رکھتے ہوئے، دو راجہ رانی سوتے تھے
ہر سمت سُنہرے گہنوں کے انبار لگائے جاتے تھے
"سونا" تو بچایا جاتا تھا "انسان" جلائے جاتے تھے

(۲۶ راگست)

# قصرِ زرنگار

بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم
نگاہِ شوق میں فضائے گلستاں لئے ہوے
ضمیرِ خلق میں بنائے کہکشاں لئے ہوے
نئی زمین پر نیا اک آسماں لئے ہوے
نہادِ غم پہ رکھ رہے ہیں طرح خوشگوار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

بنا رہے ہیں لالہ زار دشت گیر و دار کو
لہو کا شوخ رنگ دے رہے ہیں کارزار کو
کہاں ہم ایسے منچلے ملیں گے روزگار کو
گئے ہوے ہیں جان و دل ہنسی خوشی نثار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

ارادے حوصلہ شکن ہیں وقت نحس و شوم کے
خدنگ و سنگ پھینکتا ہے ظلم جھوم جھوم کے
مگر جبینِ شاہدِ عمل کو چوم چوم کے
دل و جگر پہ روکتے ہیں مسکرا کے وار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

چمن خوشی کا جل گیا، سکوں کا گھر اُجاڑ ہے
بلا کی شب طویل ہے، غضب کا دن پہاڑ ہے
زمیں سے تا بہ آسماں، نہ چھاؤں ہے نہ آڑ ہے
مگر بفیض ولولہ ہیں آپ اک حصار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

حیات کو شرار پر تپا رہی ہے زندگی
ہری بھری جوانیاں، جلا رہی ہے زندگی
ستارے توڑ توڑ کر لٹا رہی ہے زندگی
بنے ہوئے ہیں جشنِ قتل گاہ کی بہار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

برہنگی کے ڈھانپنے کو چھال کاٹتے بھی ہیں
گرسنگی میں پیٹ پتھروں سے پاٹتے بھی ہیں
جو پھونکتی ہے تشنگی تو خون چاٹتے بھی ہیں
یہ مانتے نہیں جہادِ زندگی میں ہار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

بھری ہوئی ہیں جانگداز پتھروں سے جھولیاں
اِدھر سے تیر چل رہے ہیں، اُس طرف سے گولیاں
حیات کے لہو سے کھیلی جا رہی ہیں ہولیاں
پر اس لہو سے لکھ رہے ہیں تازہ شاہکار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

زمین ڈگمگا رہی ہے زلزلوں کے زور سے
پہاڑ تھر تھرا رہے ہیں آندھیوں کے شور سے
دھواں سا اُٹھ رہا ہے زندگی کے پور پور سے
اُلجھ اُلجھ کے کھینچتے ہیں سانس بار بار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

نہ امن کی حیات ہے نہ آشتی کا دین ہے
گھُر گھُر رہے آسماں، دھواں دھواں زمین ہے
ہزار ہیں رُکاوٹیں مگر ہمیں یقین ہے
کہ نوعروس مدعا سے ہوں گے ہمکنار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

(۲۷، اگست)

# اے جنونِ زندگی!

اے جنونِ زندگی! زنجیرِ در کھڑکائے جا
گُل کے گُل نکلے نہیں ہیں تیرے دیوانے ابھی
شمع سے کچھ دُور پر بیٹھے ہیں پروانے ابھی
شعلہ گوں احساس کی لَو دمبدم اُکسائے جا
اے جنونِ زندگی زنجیرِ در کھڑکائے جا

نشۂ ماضی کے ماتے، رچ کے مہندی پاؤں میں
سو رہے ہیں مست، شیشوں کی گلابی چھاؤں میں
اُن کے چہروں پر عمل کی دھوپ سی دکھلائے جا
اے جنونِ زندگی زنجیرِ در کھڑکائے جا

تک رہے ہیں مسکنوں سے ظلم کے مارے ہوئے
اپنی ہستی سے ڈرے، سہمے، تھکے ہارے ہوئے
سرد ہوتا جا رہا ہے ان کا خوں، گرمائے جا
اے جنونِ زندگی زنجیرِ در کھڑکائے جا

رازِ ہستی کو نہ جانا، ماماؤں نے ابھی
اپنا خرمن خود نہیں پھونکا ہے ماؤں نے ابھی
آگ کے تاروں پہ انگاروں کے نغمے گائے جا
اے جنونِ زندگی زنجیرِ در کھڑکائے جا

ریشمی پردوں سے پرچم، اب بھی بن پائے نہیں
عصمتوں کی شاخ میں راحت فزا سائے نہیں
شرمگیں چہروں کے آنچل بے جھجک سرکائے جا
اے جنونِ زندگی زنجیرِ در کھڑکائے جا

تیرے متوالے جو دوڑے ہیں تری آواز پر
اُن کو مدہوشانہ گانے دے جنوں کے ساز پر
گرم نغموں سے دلوں کی آگ کو بھڑکائے جا
اے جنونِ زندگی زنجیرِ در کھڑکائے جا

آفتوں کی زد پہ سینے تان کر یہ آئے ہیں
زندگی کی سختیوں کو جان کر یہ آئے ہیں
موت کو اِن فاتحوں کی صورتیں دکھلائے جا
اے جنونِ زندگی زنجیرِ در کھڑکائے جا

(۲۹ر اگست)

# چل اور چلا چل ساتھی!

چل اور چلا چل ساتھی!
تلووں کے تپکتے چھالے
مدرا کے چھلکتے پیالے
آنکھوں کے ٹپکتے آنسو
ساون کے چمکتے جُگنو

کر من کو نہ چنچل ساتھی
چل اور چلا چل ساتھی

یہ رین کی گھور اندھیاری
یہ رہبر کی ٹکھ پر دھاری
دھارے گی کرن جوتی کی
دے دے گی لڑی موتی کی

بجلی ہے یہ بادل ساتھی
چل اور چلا چل ساتھی

لاشیں ہیں یہ کیسی بن میں
گولی کے گھاؤ ہیں تن میں
سینوں سے لہو بہتا ہے
بہہ بہہ کے یہی کہتا ہے

بن خون کی ہلچل ساتھی
چل اور چلا چل ساتھی

یہ سُرخ گھٹا کیسی ہے
کیا بن میں آگ لگی ہے
بارُود کی لَو تھرائی
انسان جلے، بُو آئی

دوزخ ہے کہ جنگل ساتھی
چل اور چلا چل ساتھی

کانٹوں میں یہ اُلجھے آنچل
جھاڑی میں یہ ٹوٹی پائل
یہ گرد میں لت پت کنگن
کیا لُٹ کے گئی ہے دوطن

ہے دھول میں صندل ساتھی
چل اور چلا چل ساتھی

وہ دُور پہ، اُس بستی میں
دُکھ درد بھری مستی میں
کچھ لوگ گمر کستے ہیں
آفت میں کھڑے ہنستے ہیں

یہ دیس ہے پاگل ساتھی
چل اور چلا چل ساتھی

کیوں آنکھ تری بھر آئی
کیوں دل پہ اُداسی چھائی
پربت سے ہوا آتی ہے
جھرنوں کی صدا آتی ہے

یا بجتی ہے چھاگل ساتھی
چل اور چلا چل ساتھی

چل جیسے چلے فوّارا
چل جیسے مچلتا دھارا
بڑھ جیسے بڑھے ہریالی
اُٹھ جیسے اُٹھے جُھک ڈالی

بن مست ہوا چل ساتھی
چل اور چلا چل ساتھی

(۳۰ر اگست)

# ایک آہ

وہ آبادی کہ جس سے کانپتی ہے روحِ ویرانی
وہ آزادی کہ جس کا ایک اک لمحہ ہے زندانی

ہوا میں گولیوں کی سنسناہٹ، دمبدم، ہر سُو
فضا میں خون ٹپکاتے ہوئے انسان کے بازو
زمیں پر سُرخ دھبے، خون کی پرچھائیاں جیسے
بسنتی رنگ سے کھیلی ہوئی انگنائیاں جیسے
فضائے ہند عبرت گاہ سی معلوم ہوتی ہے
زمیں کے ہونٹ پر اک آہ سی معلوم ہوتی ہے

(ستمبر سنہ ۴۲ء)

# دھواں

نذرِ آتش سازو برگِ آشیاں ہے آج کل
بوئے گُل کیسی گُلستاں میں دھواں ہے آج کل

خاک برسر ہے جمالِ زندگی و آشتی
نذرِ ماتم گیسوئے امن و اماں ہے آج کل

نشترِ غم یادِ یارِ مہرباں ہے اِن دنوں
موجِ خونیں بوئے جوئے مولیاں ہے آج کل

اک فغاں صحرا بصحرا، ایک نالہ کو بکو
ایک ماتم کارواں در کارواں ہے آج کل

عشق کے دل سے جو پیہم خون ٹپکاتی رہی
حُسن کے سینے میں وہ نوکِ سناں ہے آج کل

بے خبر تعمیرِ آئندہ سے جانِ بے زری
فکرِ مستقبل میں روحِ زرگراں ہے آج کل

قیدِ محکومی پہ قیدِ چاردیواری بھی ہے
آسماں اک اور زیرِ آسماں ہے آج کل

(ستمبر ۴۲ء)

# فیصلہ

آج جس منزلِ آفت میں قدم ہیں اے دوست
ایک دنیا ہے بسائی ہوئی آزاروں کی

آنچ کی طرح نکلتی ہے لپٹ پھولوں سے
ڈنک سی روح میں چُبھتی ہے کرن تاروں کی

"لُو" جلا دیتی ہے ماتھے کا مہکتا صندل
دھوپ پی جاتی ہے مَے چمپئی رخساروں کی

آبشاروں کا لہو خشک ہوا جاتا ہے
ہڈیاں چور ہوئی جاتی ہیں کُہساروں کی

راہ مسدود ہے تاریک ہے پھر بھی ہمدم
ہے منارے پہ نظر قافلہ سالاروں کی

زندگی مصلحتِ وقت پہ رکھتی ہے نگاہ
آرزو ڈھونڈھتی رہتی ہے فضا تاروں کی

یوں تمنّا کو جگاتی ہیں اُمنگیں جیسے
گُدگُدی موج میں ہو چھیڑ سے پتواروں کی

غم کے آغوش میں کب زیست کو چین آتا ہے
دیکھ آئینۂ طوفاں میں تڑپ تاروں کی
پھیر لوں پاؤں رہِ عزم سے کیونکر اے دوست
کبھی پیچھے کو پلٹتی ہے روش دھاروں کی؟

(ستمبر ۴۲ء)

# "نانِ جو"

جوئے عمل اُبل پڑی، سینۂ کوہسار سے
بندشِ رہ سے کب رُکی، عزم کی سیل تُند رو

صبح کی کارگاہ میں اہلِ ہوس اب آئے ہیں
پھوٹ کے اوّلیں کرن دے بھی گئی پیامِ نو

پہلوئے انقلاب میں، آگ سُلگ رہی تھی کل
سینۂ کائنات سے آج نکل رہی ہے لو

ظلم کی کائنات میں، عدل کا یہ اصول ہے
اہلِ جفا کو شہد و شیر، اہلِ وفا کو نانِ جو

(ستمبر ۴۲ء)

# کل نہ رہے گا

ہستی کے فرح بخش و جہاں تاب افق پر
یہ دھند، یہ کہرا، یہ دھواں کل نہ رہے گا
چشم ولب و رخسار کا ذی روح خزانہ
مدفون و سیہ پوش و نہاں کل نہ رہے گا
مل جائے گا احساس کو اک چشمۂ احساس
ایمائے نظر تشنہ وہاں کل نہ رہے گا
انسان کی ایجاد کا یہ خنجرِ خوں ریز
انسان کی گردن پہ رواں کل نہ رہے گا
خرمن کے لئے خون بہاتا ہے جو دل کا
وہ حوصلہ نذرِ دگراں کل نہ رہے گا
وہ دل کہ جو سرمایۂ احساس خودی ہے
نذرِ ستم و نازِ بُتاں کل نہ رہے گا

بچ جائے گی اندیشۂ رہزن سے رہِ سود
عالم ہدفِ تیرِ زیاں کل نہ رہے گا
انسان کی محفل ہی میں ہو جائے گا شامل
انسان خداوندِ جہاں کل نہ رہے گا

(ستمبر ۴۲ء)

# "سُرخ لکیر"

سعیٔ جانکاہ کو اک خرمن حاصل کی طرف
سیل پُرشور کو اک امن کے ساحل کی طرف
کرۂ خاک کو اک چاند سی منزل کی طرف
دیر سے گرم سفر دیکھ رہا ہوں اے دوست

ذہن کے گوشۂ تاریک کی ویرانی پر
خاک آلود و حزیں چہرۂ انسانی پر
وقت کے مطلعِ غمناک کی پیشانی پر
اک تبسّم کا اثر دیکھ رہا ہوں اے دوست

عالمِ بحر کے آشوب اثر منظر میں
وادی و کوہ کے فولاد شکن پیکر میں
لالہ و گُل سے بہت دُور مہ و اختر میں
خندۂ راہگزر دیکھ رہا ہوں اے دوست

ابر کی آڑ میں بیتاب ہے اک سُرخ لکیر
ڈوب کر جیسے لہو میں ابھر آیا ہے تیر
اسی خونبار نظارے میں، بہ رنگِ تعبیر
غازۂ روئے بشر دیکھ رہا ہوں اے دوست

(اکتوبر ۴۲ء)

# کیوں گنگا کے دھارے!

(بنگال کا قحط)

کیوں گنگا کے دھارے
تجھ میں چمکیں تجھ میں جھمکیں "روپ گگن" کے تارے
تجھ میں لہکیں تجھ میں مہکیں، جل منڈل کے پیارے
اور ترے ریتل پر تڑپیں دھرتی کے مہ پارے
کیوں گنگا کے دھارے

کومل ڈیل، منورم جیون، سندر سوانگ رچائے
آکالی جوالا کی لَو میں، کُمھلائے مرجھائے
جگنو چنگاری بن جائیں، پھول بنیں انگارے
کیوں گنگا کے دھارے

چندر مکھی سونے کا بیڑا، تیری گود میں کھیلے
آکاشی گنگا سے برسیں، دھن کے جو ہی بیلے
"کال بھون" میں پھڑکیں تڑپیں، جیون کے شہ پارے
کیوں گنگا کے دھارے

گرم بگولوں میں تھرائے، ساون کی ہریالی
کوئل کوکے، روئے پپیہا، کانپے ڈالی ڈالی
کیسے مور مگن منگل سے، جنگل میں جھنکارے
کیوں گنگا کے دھارے

نینوں کے تارے بجھ بجھ کر، گود میں آنکھیں موندیں
ممتا کی کومل چھاتی سے ٹپکیں خون کی بوندیں
چاند بگولوں میں چکرائے، آگ میں لوٹیں تارے
کیوں گنگا کے دھارے

تیرے پریمی انگاروں سے پیٹ کا دوزخ پاٹیں
بھوک اور پیاس میں بوٹی نوچیں، خون پئیں، قے چاٹیں
تیری چھاگل دن دن چھلکے، سسکیں پیاس کے مارے
کیوں گنگا کے دھارے

مردوں نے دم توڑ دیے، بے آس ہوئیں مہلائیں
جان سے بھی پیارے بچوں کو، بیچ رہی ہیں مائیں
تپتی کوکھ، دہکتی چھاتی، جلتے ہوئے گہوارے
کیوں گنگا کے دھارے

کلیاں دیں رنگت بھر بھر کر، بھونرا رنگ اُڑائے
شبنم دے موتی چُن چُن کر، سورج روپ سجائے
"ہنسا"، شیش محل بنوائے، ہم دیں خون کے گارے
کیوں گنگا کے دھارے

لوٹ چکی ہے لوبھی دُنیا، جیون کی ہر آشا
اُجڑی مانگ، کلائی سونی، دولھن ہے یا لاشا
ماتم کی لے میں کھو جائیں جیون کے جھنکارے
کیوں گنگا کے دھارے

ہم تو بھوکے ہم تو پیاسے، تیرے "تٹ رکھوالے"
تو نے کس ہردے سے بانٹے، لابھ کے میٹھے پیالے
سوکھے ہونٹ ہمارے کانپیں، دنیا لے چٹخارے
کیوں گنگا کے دھارے

کب تک روکیں، کب تک جھیلیں، یہ طوفانی دھاریں
کٹ کٹ کر گر گر پڑتی ہیں، ہردے کی دیواریں
رات کے سناٹے میں ٹوٹیں جیسے تیرے گگارے
کیوں گنگا کے دھارے

گھر شمشان، کھنڈرسی گلیاں، بستی ہے یا پرتی
تو نے اب جو دیر لگائی، جل جائے گی دھرتی
تجکو پیاسے نینوں سے، تکتے ہیں تیرے پیارے
بڑھ گنگا کے دھارے

مُردوں کے سنسان نگر میں، جیون رس برسا دے
فاقوں کی ماری دُنیا کو، امرت میں نہلا دے
دھرتی کی چھاتی سے اُبلیں، جیون کے فوارے
بڑھ گنگا کے دھارے

جھوم کے آنچل سے برسا دے، ساون کی ہریالی
کوئل کوکے، گائے پپیہا، جھومے ڈالی ڈالی
چھاؤں بڑھے، ہریالی پھیلے، پیڑ اُگیں چھتنارے
بڑھ گنگا کے دھارے

تیری دھار میں تنکا بن کر، سارے دُکھ بہ جائیں
کال سے چھُٹ کر دُکھیا جیون، تیری مہما گائیں
پھوٹ پڑے سنگیت دلوں سے، چھیڑ دے من اکتارے
بڑھ گنگا کے دھارے

سُکھ کے دن سے اُٹھ ہی جائے، دُکھ کی رین کا ڈیرا
جائے جلد اندھیرا جائے، آئے جلد سویرا
"سارا ٹھاٹھ پڑا رہ جائے، لاد چلیں بنجارے"
بڑھ گنگا کے دھارے

(دسمبر ۱۹۴۳ء)

# روشن اندھیرا

(۴۲ء کی تحریک سے متعلق یہ نظم فروری ۴۶ء میں لکھی گئی)

بن گئی تھی سر زمینِ ہند میدانِ قتال
زندگی نے زندہ رہنے کا اٹھایا تھا سوال
تھا زبانوں پر یہ نعرہ "آشیاں کو چھوڑ دو"
"چھوڑ دو اے غاصبو ہندوستاں کو چھوڑ دو"
اس صدا نے چوٹ پہنچائی ستم کے ناز پر
چھا گئیں توپیں گرج کر، درد کی آواز پر
موت کا پرچم فضا کے دوش پر لہرا گیا
زندگی کے صحن میں، غم کا اندھیرا چھا گیا
اُس اندھیرے میں گھروں کی، روشنی لوٹی گئی
موت نے خوشیاں منائیں، زندگی لوٹی گئی
دل کو ہر ناموس کے ناسور کر ڈالا گیا
شرم کا انمول موتی چور کر ڈالا گیا

چھاونی ظالم لٹیروں کی پڑی تھی سامنے
لاج سیتا کی جھکائے سر کھڑی تھی سامنے
بے ردا تھی عزتِ مسلم ہجوم عام میں
سر برہنہ کارواں جیسے دیارِ شام میں
آبرو کا چاند جب آشوب کے ہالوں میں تھا
اپنا بھائی بھی تماشہ دیکھنے والوں میں تھا
تھا وطن آفت میں یارانِ وطن دیکھا کیے
آشیاں لُٹتا رہا، اہلِ چمن دیکھا کیے
بے جگر کہتے تھے غم کی تاب کیا لاؤگے تم
آگ وہ دہکی ہے جل کر خاک ہو جاؤگے تم
اُن سے کہہ دو بات وہ جن کی ہوا میں کھوگئی
تپ کے سونا بن گئے ہم، آگ ٹھنڈی ہو گئی

---

سچ کی دنیا جھوٹ کی ظلمت سے کالی تھی ضرور
موت نے ہستی پہ وقتی فتح پالی تھی ضرور

پا بجولاں عشق تھا ، اہلِ وفا جیلوں میں تھے
ہم تھے بے منزل ہمارے رہنما جیلوں میں تھے
ہم بھٹکتے پھر رہے تھے ، ایک منزل کیلئے
ناؤ چکّر کاٹتی پھرتی تھی ساحل کے لئے
ہم نے کی تھی جنگ امن وآشتی کے واسطے
موت سے لی تھی لڑائی زندگی کے واسطے
ہر عمارت اپنے ہاتھوں اس لئے ویران کی
نیو ہم کو ڈالنا تھی اک نئے ایوان کی
شورشیں کرتے تھے برپا، چین لینے کیلئے
بن گئے تھے ہم فسادی، امن دینے کیلئے
غم کو پھیلا کر زمانے میں خوشی کے واسطے
ہم نے ظلمت کو بڑھایا، روشنی کے واسطے
مول لیں بربادیاں ، آباد ہونے کے لئے
بند جیلوں میں رہے آزاد ہونے کے لئے
اس خطا پر ظلم سے احکامِ بربادی ملے
کیوں کہا تم نے کہ انسانوں کو آزادی ملے

پر عمل کی راہ میں کب مانتے تھے ہار تم
تھے وطن کے جاں نثار و! عزم کی تلوار تم
تم نے کی پیکار آفت سے تباہی سے لڑے
حق کی تابانی تھے، باطل کی سیاہی سے لڑے
گولیاں کیں رد اہنسا کی ملائم دھات سے
دھاریں تلواروں کی موڑیں تم نے خالی ہات سے
تان کر سینے کو روکے وار ہر تلوار کے
بوئے گُل سے رہ گئی صحرا کی آندھی ہار کے
وہ اُٹھے طوفان بیڑے دب گئے پُل بہہ گئے
ہو گئے تم پار اور دشمن تمہارے رہ گئے
لے چلا تھا ظلم گرداب فنا میں ٹھیل کے
تم نکل آئے مگر طوفان سے ہنس کھیل کے
تم چلے اور زندگی کا رنگ برساتے چلے
ظالموں کو خون کی گنگا میں نہلاتے چلے
چھاتیوں کے پار ہوتیں سنسناتی گولیاں
ہولیاں خوں کی مناتی منچلوں کی ٹولیاں

کمسنی بڑھتی جو آگے بن کے مستی موج کی
شرم سے گردن جھکا لیتی جوانی فوج کی
ٹوٹتا کوئی کنول جب زندگی کے جھاڑ سے
ماں کے آنسو مسکراتے چلمنوں کی آڑ سے

---

او وطن کے سرفروشو! تم پہ شاعر کا سلام
نقش ہیں ہستی کے سینے پہ تمھارے نیک نام
دل میں ہو موجود نظروں سے بظاہر کھو گئے
موت نے دی زندگی، تم مر کے زندہ ہو گئے
تم ہو یوں پنہاں فنا کے پردۂ غمناک میں
جس طرح بادل میں تارا، جیسے موتی خاک میں
اہلِ دل یادیں تمھاری محو کر سکتے نہیں
تم ہمیشہ کے لئے زندہ ہو مر سکتے نہیں
مل کے مٹی میں نئی دنیا بسانے کے لئے
سو گئے تم روحِ انساں کو جگانے کے لئے

آہ وہ سینے کہ جن پر گولیوں کے ہیں نشاں
پھول برساتا رہے گا حشر تک ہندوستاں
وہ تمھارے چاند سے ٹکڑے جو خوں میں بھر گئے
جاودانی مشعلیں سینوں میں روشن کر گئے
خون ضو دیتا رہے گا آسماں کے جھاڑ سے
ہر سحر تم مسکراؤ گے شفق کی آڑ سے
موت قدموں کی تمھارے گرد پا سکتی نہیں
وہ دیا ہو تم جسے آندھی بجھا سکتی نہیں
لو کے جھونکوں میں بدل جائے ہوا گلزار کی
پنکھڑی کوئی نہ ٹوٹے گی تمھارے ہار کی
جب وطن میں جشن آزادی منایا جائے گا
شادمانی کا دیا گھر گھر جلایا جائے گا
زندگی جب سانس لے گی، عالمِ آزاد میں
غمزدوں کے دل بھر آئیں گے تمھاری یاد میں
کامرانی کی خوشی سے ہوں گے جب معمول ہم
لے کے آئیں گے تمھاری قتل گہ میں پھول ہم

خاک میں سوئے جوانی میں چمن کو چھوڑ کر
آسماں تم پر لٹائے گا ستارے توڑ کر

ہم تمھاری یاد میں ، زندہ دلانِ دردمند
ایک مینارا بنائیں گے ہمالہ سے بلند

جو فرازِ انجم و خورشید کو شرمائے گا
جس پہ دائم پرچمِ ہندوستاں لہرائے گا

(سنہ ۴۶ء)

# (تو کب تک آئے گا؟)

تو کب تک واپس آئے گا ہندی فوج کے پیارے
تیری فوج کے فوجی پلٹے، پلٹیں تیری فوجیں
تیرا دھارا واپس آیا، آئیں تیری موجیں
تیری ناؤ ہے کس طوفاں میں، تو ہے کون کنارے
تو کب تک واپس آئے گا ہندی فوج کے پیارے

البیلا ڈھلن آیا، آیا متوالا سیگل
شاہ نواز آیا، سرکاتا ظلم کے کالے بادل
چیر گھٹا کو تو بھی چمک او ہند کے روشن تارے
تو کب تک واپس آئے گا ہندی فوج کے پیارے

دھوم ہے آنے والوں کی، بجتا ہے خوشی کا باجا
آئی جھانسی کی رانی، آ تو بھی دلوں کے راجا
دل کا دیس ہے سونا تجھ بن، دیس کے راج دُلارے
تو کب تک واپس آئے گا ہندی فوج کے پیارے

تیری یاد میں گم ہے تیری دید کا ہر شیدائی
ڈھونڈھ رہا ہے جیل سے چھُٹ کر، تجھ کو تیرا بھائی
آ پیارے بھائی سے مل جا، او بھائی کے پیارے
تو کب تک واپس آئے گا ہندی فوج کے پیارے

مار کے تو ظالم راون کو، ڈھا کے ستم کی لنکا
امن کا پرچم لہرا کر، بجوا کے و جَے کا ڈنکا
چودہ سال میں پلٹے گا کیا او بن باس کے مارے
تو کب تک واپس آئے گا ہندی فوج کے پیارے

قحط کی ماری دنیا میں، آ دیکھ خوشی کا عالَم
اُبھرے غریبی کے گھُرے سے، خوش حالی کے پرچم
جھلکے غلامی کے بادل سے، آزادی کے تارے
تو کب تک واپس آئے گا ہندی فوج کے پیارے

آ ہی گیا وہ دن جب اُترے ظلم و ستم کی مستی
اپنے دیس سدھاریں دشمن، چھوڑ کے تیری بستی
سارا ٹھاٹھ پڑا رہ جائے، لاد چلیں بنجارے
تو کب تک واپس آئے گا ہندی فوج کے پیارے

(سنہ ۴۶ء)

# ترنگا پرچم

وہ پرچم جو ۱۹۴۲ء میں ظلم کے ہاتھوں نذر خاک و خون ہوا

لیکن

۱۹۴۶ء کے "یوم آزادی" میں پھر سر بلند ہوا۔

جگمگا ہندی پھریرے، جگمگا قومی نشاں
تجھ پہ قرباں چاند تارے، تجھ پہ صدقے کہکشاں

دھوپ اور کانٹوں سے لڑ کر، لے کے چھالے پاؤں میں
"لو" کے مارے آ ٹکے ہیں آج تیری چھاؤں میں
آرہی ہے تیرے دامن سے ہمالہ کی ہوا
اپنی جھولی میں لئے سینوں کے زخموں کی دوا
دھوپ کے مارے ہوؤں کو چھاؤں دکھلاتا ہے تو
ماں کا آنچل جھلملاتا ہے کہ لہراتا ہے تو
تو نے پرچم کو اڑا کر وقت کے پھیلاؤ پر
رکھ دیا تسکین کا پھاہا دلوں کے گھاؤ پر

سر کو چھاتی سے لگا کر، گرد رُخ کی جھاڑ کے
ماں نے پٹی باندھ دی بیٹے کو، آنچل پھاڑ کے
بھر چلے پھر گھاؤ دل کے، زخم پھر ہم کھائیں گے
خون کی لہروں سے کھیلیں گے، تجھے لہرائیں گے

جگمگا ہندی پھریرے، جگمگا قومی نشاں
تجھ پہ قرباں چاند تارے، تجھ پہ صدقے کہکشاں

آ کے سائے میں ترے یاد آگیا وہ انقلاب
جس کی خونی آگ میں پھاندا تھا متوالا شباب
آگ جو بھڑکی ہوئی تھی چار سو، کیا آگ تھی
وہ تو انسانوں کو ڈستی تھی وہ کالا ناگ تھی
جل رہے تھے پیڑ پودے پھول پتے ڈالیاں
جن کا گلشن تھا بجاتے تھے خوشی کی تالیاں
"باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے"
"جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے"
جان دے دی شان اے قومی نشاں جانے نہ دی
جل مرے ہم پر ترے دامن پہ آنچ آنے نہ دی

جگمگا ہندی پھریرے ، جگمگا قومی نشاں
تجھ پہ قرباں چاند تارے ، تجھ پہ صدقے کہکشاں
منچلے اب تجھ کو لہرائیں گے ، رُک سکتے نہیں
دل ہیں پربت ٹوٹ سکتے ہیں پہ جُھک سکتے نہیں
"زور" آزادی کے جذبے کو دبا سکتا نہیں
"بند" اب سیلاب کو پیچھے ہٹا سکتا نہیں
ظلم جوشِ دل سے ٹکرا کر فنا ہو جائے گا
یہ محل بالو کا آندھی میں ہَوا ہو جائے گا
سچ بڑھے گا جھوٹ پیچھے کو کھِسکتا جائے گا
دھوپ اُترتی جائے گی سایہ سرکتا جائے گا
تابکَے ، چوسیں گے خوں ، پلٹے گی مست خونخوار کی
بھوک سے مر جائیں گی جونکیں سمندر پار کی
جگمگا ہندی پھریرے ، جگمگا قومی نشاں
تجھ پہ قرباں چاند تارے ، تجھ پہ صدقے کہکشاں

# کارواں

او، زندگی کے کارواں!
چل موت کو ٹھکرا کے چل
کیوں تھم گئے تیرے قدم
کیوں رُک گیا لہروں کا رم
یہ کال کا میدان کیا
فاقوں کا ریگستان کیا
تو زندہ دل تو نوجواں
او زندگی کے کارواں
چل موت کو ٹھکرا کے چل
آنے نہ پائے وہ گھڑی
جب دھوپ ہو جائے کڑی
فاقوں کی لو چلنے لگے
انسانیت جلنے لگے
اُٹھنے لگے دل سے دھواں
او زندگی کے کارواں
چل موت کو ٹھکرا کے چل

تڑپیں نہ پیارے آگ میں
ٹوٹیں نہ تارے آگ میں
معصوم بچے لالہ گوں
چاٹیں نہ قے، چوسیں نہ خوں
بچوں کو کھا جائے نہ "ماں"
او زندگی کے کارواں
چل موت کو ٹھکرا کے چل
بالوں سے مُنہ کو ڈھانپ کے
بہنیں کہیں کیوں کانپ کے
"لو، نوچ لو، تم بوٹیاں"
"دے دو مگر دو روٹیاں"
"بھائی ہے میرا نیم جاں"
او زندگی کے کارواں
چل موت کو ٹھکرا کے چل

ایسا نہ وقت آئے کہیں
مُردوں سے پٹ جائے زمیں
مُردے پڑے سڑنے لگیں
لاشوں پہ گِدھ لڑنے لگیں
بستی پہ ہو بن کا گماں
او زندگی کے کارواں
چل موت کو ٹھکرا کے چل

کیا دشتِ غم کیا خارِ غم
تھم کیوں بڑھا آگے قدم
صحرا کو دے ہریالیاں
پھل پھول پودے ڈالیاں
بن کو بنا دے بوستاں
او زندگی کے کارواں
چل موت کو ٹھکرا کے چل

گھر گھر میں آئے ناچتی
چھم چھم چھما چھم چھمی
جمنا کی رَو، مُرلی کی دُھن
مُٹھی میں دُھن، آنچل میں ہُن
دولت کی گنگا ہو رواں
او زندگی کے کارواں
چل موت کو ٹھکرا کے چل

آفت میں ہل مل جائیں ہم
اس کال سے ٹکرائیں ہم
دنیا کو دُکھ بھرنے نہ دیں
انسان کو مرنے نہ دیں
انسان ہے جانِ جہاں
او زندگی کے کارواں
چل موت کو ٹھکرا کے چل

کیوں تھم گئے تیرے قدم
کیوں رُک گیا لہروں کا رم
یہ کال کا میدان کیا
فاقوں کا ریگستان کیا

تو زندہ دل تو نوجواں
او زندگی کے کارواں
چل موت کو ٹھکرا کے چل

(سنہ ۴۶ء)

# ہمارا ہندستان

کوئی گر پوچھے کہ راہی تیرا مسکن ہے کہاں
فخر کا سر کر کے اونچا میں کہوں "ہندوستاں"
ہاں وہی ہندوستاں جس نے کہ پالا ہے مجھے
علم اور تہذیب کے سانچے میں ڈھالا ہے مجھے
ہم ہیں جس کی گود میں آباد صدہا سال سے
ہم کو جس نے کم کبھی سمجھا نہ اپنے "لال" سے
جس کے دامن میں ہمارے باپ دادا سب پلے
پَل کے آرام و خوشی کے باغ میں پھولے پھلے
پھول پھل کر جو چمن کی خاک ہی میں کھو گئے
آنکھ جس گودی میں کھولی تھی اُسی میں سو گئے
جس کے ہر گوشے میں ہے اپنے اعزا کا مزار
پیاری ماں بہنوں کا مدفن، باپ دادا کا مزار
یار جس میں دفن ہیں یاروں کے پیارے دفن ہیں
جس کے ہر ٹکڑے میں لاکھوں چاند تارے دفن ہیں

اپنی پیاری مسجدیں ہیں جس کی خاکِ پاک پر
جن کے گنبد طعنہ زن ہیں گنبدِ افلاک پر
صبح کے تاروں کی ضو میں، مندروں کے درمیاں
جن کے گلدستوں پہ مسلم روز دیتا ہے اذاں
گونج اُٹھتی ہے فضا اپنی صدائے کوس سے
لہریں ٹکراتی ہیں تکبیروں کی ہر ناقوس سے
ہم جو کرتے ہیں بلند آواز دیں کے نام کی
کان میں ہندو کے پڑتی ہے صدا اسلام کی
جس زمینِ پاک پر وہ خانقاہیں اپنی ہیں
بہرہ ور جن کی زیارت سے نگاہیں اپنی ہیں
روح وابستہ ہے اُن روضوں کے صحن و بام سے
سو رہے ہیں جن میں اپنے پیشوا آرام سے
مٹ گئے ہم پھر بھی تابندہ ہمارا راج ہے
چاندنی میں جگمگانے والا سیمیں "تاج" ہے
باغ ہیں پھولے پھلے اپنے میان سبزہ زار
دل ہے جن کے بور کی مانوس خوشبو پر نثار

پیاری پیاری اپنی جھیلیں ہیں چہیتے گاؤں ہیں
جھلملاتی ہیں جو تاروں کی سُہانی چھاؤں میں

لہلہاتی کھیتیاں ہیں پھول پھل کلیاں بھی ہیں
بچپنا کھیلا ہے اپنا جن میں وہ گلیاں بھی ہیں

اپنی ماں بہنیں بھی اولادیں بھی مانجائے بھی ہیں
کام جو دُکھ سُکھ میں آتے ہیں وہ ہمسائے بھی ہیں

کوئی گر پوچھے کہ راہی تیرا مسکن ہے کہاں
فخر کا سر کر کے اونچا میں کہوں "ہندوستاں"

(سنہ ۴۶ء)

# نئی تعمیر

## آزاد ہند حکومت کے قیام پر

جب لگی تھی آگ ہر سو، جل رہا تھا بوستاں
پھڑپھڑاتا تھا قفس میں طائرِ ہندوستاں
جب کڑکتی تھیں زمانے میں کمانیں ظلم کی
سینۂ انسانیت پر تھیں چٹانیں ظلم کی
پڑ گئی تھی زندگی کے دل میں جب خونخوار پھانس
قید کے ماحول میں ہندوستاں لیتا تھا سانس
تم نے اے انسانیت کے خیر خواہو! مرحبا
ڈال دی سرِ پیچ کے ہندی حکومت کی "بنا"
وہ "بنا" جو درس دیتی ہے نئے مضمون سے
روشنی کی تم نے جس کی تہہ میں اپنے خون سے

جانیں جاتی تھیں پہ کچھ شکوہ نہ کچھ افسوس تھا
جس "نئی تعمیر" کا "معمارِ اعظم" "بوس" تھا

"بوس" جو ہندوستاں کی گود سے گُم ہو گیا
مصر کی آنکھوں میں آنسو ہیں کہ یوسف کھو گیا

غم نہ کر ہندوستاں! ہنگام دار و گیر میں
زندگی ہے کارفرما "بوس" کی تعمیر میں

یہ "نئی تعمیر" اب تابندہ ہوتی جائے گی
سربلند و محکم و پائندہ ہوتی جائے گی

# بڑھ چل ہندستان

## (قومی ترانہ)

بڑھ چل ، بڑھ چل ، ہندستان!
کیسا دشمن ، کیسی فوج
کیسا دریا ، کیسی موج
چل اے آندھی، اُٹھ طوفان
بڑھ چل، بڑھ چل، ہندستان

کس کی گدی ، کس کا تاج
کس کی دھرتی ،کس کا راج
"جنتا" شہ "جنتا" سلطان
بڑھ چل، بڑھ چل، ہندستان

کندھے سے کندھے کو جوڑ
محکومی کے بندھن توڑ
چل جیسے آزاد انسان
بڑھ چل، بڑھ چل، ہندستان

اُلجھے بکھرے گیسو دیکھ
دُکھیاروں کے آنسو دیکھ
کر بھوکے ننگوں کا دھیان
بڑھ چل، بڑھ چل، ہندستان
مزدوروں کا دَل بن کر
بادل کی ہلچل بن کر
بن کر ساگر کا طوفان
بڑھ چل، بڑھ چل، ہندستان
گُل صدقے، گلشن صدقے
ہندو کا تن من صدقے
مُسلم کی جانیں قربان
بڑھ چل، بڑھ چل، ہندستان
تلواروں کی دھاریں چوم
زخموں کی برکھا میں جھوم
کر خونیں جل میں اشنان
بڑھ چل، بڑھ چل، ہندستان

جھن جھن جھن جھن بولا رن
سنکی گولی سن سن سن
سر اونچا کر، سینہ تان
بڑھ چل، بڑھ چل ہندستان